إِنَّمَا أَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰهُ يُعْطِيْ

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ

مہتمم دارالعلوم دیوبند

کے قلم سے عُلومِ قاسمیہ کا ایک وقیع تعارُف

مباحثِ کتاب

دین عقیدہ و عمل کے مجموعہ کا نام ہے!

مذاہب کے رد و قبول کا حقیقی معیار عقائد ہوتے ہیں!

قرآنِ کریم کی دعوتِ فکر و تدبر!

ایمانِ تحقیقی اور ایمانِ تقلیدی پر ایک نظر!

فرقِ باطلہ کا سرچشمہ وجود!

متکلمینِ اسلام کی باطل کے نشوونما پر اصولی بندشیں!

بندگانِ عقل کی جزئیاتِ مسائل میں تگ و تاز!

فقہائے کرام کی خدمات سے جزئیاتِ دین کا دائمی تحفظ!

اسرارِ دین کی تدوین سے عقلیت پسندی کا سدِ باب!

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور "تدوینِ اسرارِ دین"!

سائنس کو اسلام کے برخلاف طبعیاتی محاذ بنانے کی سعی!

سائنس کا فکری انسداد اور حکمتِ قاسمیہ کی اعتقادی اصلاح!

حکمتِ قاسمیہ میں فطری طرزِ استدلال!

حضرت نانوتویؒ کے عمیق علم کی ایک نادر خصوصیت!

ہر منقولِ جزئی کی معقول تطبیق اور اس کی مثالیں!

قرآنِ حکیم کے پنہاں معقول حقائق کا حکمتِ قاسمیہ میں انکشاف!
شرعی دعاوی پر طبعی شواہدات سے حیرت ناک استدلالات!
منقول حقائق اور معقول دلائل کے ساتھ فصاحتِ بیانی!
حکمتِ قاسمیہ کی اعجاز بیانی کا اپنوں اور غیروں کی جانب سے اعتراف!
حکمتِ قاسمیہ اور دورِ حاضر کے ہمہ گیر اعتقادی فتنوں کا سدِ باب!
گذشتہ صدی میں حکمتِ قاسمیہ کے مستند ترجمان!
حکمتِ ولی اللہی اور حکمتِ قاسمیہ پر مولانا سندھیؒ کا التفات!
حکمتِ قاسمیہ پر دورِ حاضر میں تسہیلی انداز میں خدمت کی ضرورت!
مجلس معارف القرآن اکیڈمی قرآنِ عظیم کا حکمتِ قاسمیہ کی خدمت کے لیے مستحسن اقدام!
حکمتِ قاسمیہ کی قرار واقعی خدمت کے لیے ایک موزوں شخصیت کا انتخاب!
عالمی افادہ کے نقطۂ نظر سے حکمتِ قاسمیہ کی عربی اور انگریزی زبانوں میں ترجمانی!
مخلصین و منتسبینِ دارالعلوم دیوبند کا بنیادی فرض!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حکمتِ قاسمیہ

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

دین عقیدہ وعمل کے مجموعہ کا نام ہے۔ عقیدہ سے عمل کا وجود ہوتا ہے اور عمل سے عقیدہ کا رسوخ ہوتا ہے جیسے درخت کے بیج سے شاخوں اور برگ وبار کا وجود ہوتا ہے اور پھر شاخیں جوں جوں پھیلتی اور بڑھتی ہیں جڑ کا رسوخ اور اندرونی پھیلاؤ بڑھتا جاتا ہے۔ مجموعۂ عقائد کا نام ایمان ہے اور مجموعۂ عمل کا نام اسلام اور ان دونوں کے مجموعہ کا نام دین ہے۔ ایمان تخم کی طرح دل کی گہرائیوں میں مخفی رہتا ہے، جسے عقل وبصیرت کی آنکھ دیکھتی ہے اور اسلام برگ وبار کی طرح فضاء میں پھیلا ہوا ہوتا ہے جو سر کی آنکھ سے نظر آتا ہے۔ حدیث نبوی میں اس حقیقت کو اس طرح واشگاف فرمایا گیا ہے کہ

الایمان سرٌّ والاسلام علانیۃٌ ایمان (دل میں) چھپی ہوئی چیز ہے اور اسلام (ہاتھ پیر پر) کھلی ہوئی چیز ہے۔

ایمانی عقائد اعمال کے ردّ وقبول کا بھی معیار ہیں کہ ان کے بغیر بڑے سے بڑا عمل بھی ردّ، ناقابلِ قبول اور اکارت ہے اور یہی کسی مذہب کے حق وباطل کے پہچاننے کا بھی معیار ہیں، کیونکہ اساسی عقائد ہر مذہب میں گنے چنے چند ہی ہوتے ہیں، لمبا چوڑا قصہ

نہیں ہوتا جس کی تحقیق دشوار ہو اس لیے کسی دین کے سمجھنے یا قبول کرنے کا مختصر راستہ اس کے عقائد ہی کا دیکھنا ہے کہ وہ مخالف عقل تو نہیں ہیں: نیز صاحب شریعت تک اُن کی سند بھی متصل ہے یا نہیں؛ اس لیے کم سے کم یہ ناگزیر اور ضروری ہے کہ عقائد اور ایمان میں ایک ماننے والے کو بصیرت حاصل ہو اور وہ دین اور شریعت پر خواہ اصول کا حصہ ہو یا کلیات کا، سمجھ بوجھ کر جھکے اور ان پر دلائل اور حقیقت شناسی کے ساتھ جمے۔ اگر عقائد کا معاملہ محض سنے سنائے پر مبنی ہو، خود اپنی تحقیق یا سمجھ بوجھ کو اُس میں دخل نہ ہو تو اُسے صورتِ ایمان تو کہا جا سکتا ہے لیکن حقیقتِ ایمان باور نہیں کیا جا سکتا۔ اسی بناء پر محقق علماء میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا ہوا ہے کہ ایمانِ تقلیدی جس میں حجت و برہان اور بصیرت کا دخل نہ ہو بلکہ محض باپ دادا سے سنی سنائی ایک نقل ہو معتبر بھی ہے یا نہیں؟ ایک جماعت ادھر گئی ہے کہ ایمانِ تقلیدی معتبر بھی نہیں جب تک کہ وہ دلائل و براہین سے تحقیقی نہ بن جائے۔

اسی بنا پر قرآن حکیم نے دین و ایمان کے بارہ میں تدبّر اور تفکّر کی دعوت دی ہے جس کی جیتی جاگتی تصویر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا وجودِ باجود اور اُن کا مثالی ایمان ہے جو صاحب شریعت کے سامنے حاضر رہ کر بھی اپنے ایمان کو تحقیقی بنا کر ہی دل میں جگہ دیئے ہوئے تھے، قرآن حکیم نے اس کی تصدیق کرتے ہوئے فرمایا

اَدْعُوْا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ	(ترجمہ) بلاتا ہوں اللہ کی طرف سمجھ بوجھ کر میں
اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ وَسُبْحَانَ اللّٰهِ	اور جو میرے ساتھ ہے، اور اللہ پاک ہے
وَمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ	اور میں نہیں شریک بتانے والوں میں سے

پھر صحابہ کرام کے بارہ میں اولیت کے ساتھ اور ان کے مابعد کے لوگوں کے بارہ

میں تبعیت کے ساتھ ارشاد فرمایا گیا:

وَالَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّہِمْ لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْہَا صُمًّا وَّعُمْیَانًا۔	اور وہ لوگ کہ جب ان کو سمجھایئے ان کے رب کی باتیں نہ پڑیں ان پر بہرے اندھے ہو کر

اس کلامِ خداوندی سے ظاہر ہے کہ ایمان خواہ اجمالی ہو یا تفصیلی، اس کی بنیاد بصیرت وتحقیق پر ہوتی ہے گو اس کے درجات حسبِ استعداد متفاوت اور مختلف ہوں جس کا ثمرہ فراستِ ایمانی ہے جو ہر مؤمن کا طغرائے امتیاز ہوتی ہے، اسی لیے حدیثِ نبوی میں ارشاد فرمایا گیا:۔

اتقوا فراسة المؤمن فانه ینظر بنور اللّٰہ (الحدیث)	مؤمن کی فراست سے ڈرتے رہو کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔

جس سے صاف واضح ہے کہ ایمان دار میں بقدرِ ایمان بصیرت و فراست اور نورِ حق کا وجود لازمی طور پر ہوتا ہے، اور ظاہر ہے کہ جس حقیقت کا ثمرہ بصیرت ہو وہ بے بصیرت حقیقت نہیں ہو سکتی کہ بے بصیرتی سے بصیرت پیدا نہیں ہو سکتی جس کا حاصل وہی ایمانِ تحقیقی ہے نہ کہ سنا سنایا ایمان۔ اسی لیے اس دین میں عقل و بصیرت کی عظمت وفضیلت بیان فرما کر گویا اس کی دعوت دی گئی ہے اور اسی لیے قرآنِ حکیم نے جگہ جگہ آیاتِ الٰہی میں غور و فکر اور تدبر و تذکر اور حجۃ طلبی کی طرف بلایا ہے جو دوسرے عنوان سے اسی بصیرت و یقین کے پیدا کیے جانے کا امر ہے۔ اسی ایمانی حقیقت کو جو عقل و بصیرت اور تحقیقی حجت لیے ہوئے ہو، آیات و روایات میں کہیں حلاوتِ ایمان سے کہیں بشاشتِ ایمان سے کہیں طعمِ ایمان سے کہیں تفقہ فی الدین سے اور کہیں فہمِ سلیم سے تعبیر کیا گیا ہے۔

یہی وہ قوتِ یقین واطمینان اور تحقیقی ایمان ہے (خواہ وہ ظاہری دلائل سے قائم ہو یا باطنی حجتوں سے) جس کے ہوتے ہوئے ایک انسان ایمان کے بارہ میں ریب وشک سے بالاتر، محفوظ اور ضلالت وگمراہی سے مامون ہو سکتا ہے، پھر دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی اسے اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتی۔ پہاڑ کا اپنی جگہ سے سرکا دیا جانا ممکن ہے لیکن اس مردِ مومن کو ایمان سے ڈگمگا دینا یا کسی خلافِ ایمان بات پر اُسے پھسلا لیا جانا ممکن نہیں ہے ایک حقیقی اور مبصر مومن اس قسم کی ساری زعمی اور تخویفی قوتوں کو اپنی ایمانی طاقت سے پرِکاہ کی طرح پھونک مار کر اڑا دیتا ہے اور اس کے ایمان پر یہ بیرونی شکوک واوہام ذرہ برابر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ صحابہ کرام اور اسلافِ صالحین کی پاک زندگیاں اس پر شاہد ہیں کہ قرنِ اول میں اُنھیں ایمان لانے کے جرم میں کیا کیا ایذائیں نہیں دی گئیں، اور کیا کیا سختیاں اُن پر نہیں کی گئیں، اُنھیں ننگے بدن دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹایا گیا۔ کوڑوں کی ماریں دی گئیں۔ پابجولاں کر کے حبس وقید کی سزائیں اُنھیں بھگتنی پڑیں۔ دانہ پانی بند کر کے انھیں بھوکا پیاسا رکھا گیا لیکن اُن کے سچے اور پاک قلوب جن میں ایمانی بصیرت اور وعدہ ہائے الٰہی پر یقین واطمینان کی طاقت گھر کر چکی تھی ذرّہ برابر ان آزمائشوں سے متأثر یا دل تنگ نہیں ہوئے اور اپنے ایمان کو دنیا ومافیہا سے بڑھ کر عزیز متاعِ جان کر اس سے ایک انچ اِدھر اُدھر نہیں سرکے:

وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا	اور نہ سست ہوئے ہیں اور نہ دب گئے
وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ۔	ہیں، اور اللہ محبت کرتا ہے ثابت قدم رہنے والوں سے۔

اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا تھی کہ ان کا ایمان محض تقلیدی یا سنی سنائی بات نہ تھی بلکہ علیٰ وجہ البصیرۃ دلائل و براہین کی اساس پر قائم شدہ حقیقت تھی جس نے ایمان کو ان کے حق میں غیب محض نہیں بلکہ مثل مشاہدہ کے آنکھوں دیکھا بنا دیا تھا جس سے دنیا کی ساری شک اندازی اور وحشت انگیزی کی طاقتیں تھک کر بیٹھ رہیں لیکن ان کے بنا قلوب پر اثر انداز نہ ہو سکیں۔ اگر عیاذاً باللہ یہ ایمان افواہی یا محض سنی سنائی بات ہوتی جس میں قوتِ بصیرت و شہود نہ ہوتی تو اس کا ڈھلمل ہو جانا غیر یقینی نہ ہوتا۔

یہ فرق ضرور ہے کہ اسلام کے ابتدائی قرنِ خیر کے یہ لوگ (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین) اپنے صفاء ذہن، سلامتیٔ عقل و فطرت، قربِ عہد نبوت، فیضانِ صحبتِ نبوی قلتِ اختلاف اور براہِ راست صاحبِ نبوت سے کلامِ نبوت سننے کی وجہ سے اول مرحلہ ہی میں نورِ بصیرت کے بلند مقام پر پہنچ جاتے تھے جو سارے دلائل اور بصیرتوں کا نچوڑ تھا انھیں ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی کہ وہ نقل کے ساتھ مستقلاً عقلی دلائل کی تفتیش میں پڑ کر منقول کو معقول پر منطبق کرنے کی فکر میں پڑیں جبکہ وہ نقل و وحی ہی فیضانِ صحبتِ نبوی سے اُن پر عقل و معرفت کے سارے دروازے کھول دیتی تھی جس سے اُن کا ایمان تحقیق اور عقل و نقل کے صحیح امتزاج سے جامع اور حقیقی ایمان بن جاتا تھا۔ لیکن زمانۂ نبوت سے جوں جوں بُعد ہوتا گیا اور فلسفیانہ موشگافیوں سے فتنۂ شبہات نے عقلِ نارسا کو آگے رکھ کر وحیِ الٰہی کے راستوں میں مداخلت شروع کی جس سے سادہ لوح قلوب کی قوتِ یقین و اذعان میں فرق آنے لگا تو ضرورت پڑی کہ ایمانوں میں بصیرت پیدا کرنے کے لیے عقلی دلائل و براہین

کا ذخیرہ بھی مہیا کیا جائے اور دین کے جانباز سپاہیوں کو نقل کے ساتھ عقل صافی کے ہتھیاروں سے بھی مسلح کیا جائے جس سے وہ شک اندازوں کی مدافعت کر سکیں اور ان بندگانِ عقل پر بھی حجت تمام کی جا سکے اور ساتھ ہی اربابِ نقل و روایت کے لئے بھی ان عقلی حجتوں سے مبطلوں کے مقابلہ میں تسکین و تسلی کا سامان بہم پہونچایا جا سکے، ابتداءً فتنۂ تشکیک نے امہات عقائد اور اصول و کلیاتِ دین کو فلسفیانہ اختراعات کی آماجگاہ بنایا اور ان کی اصولیت و کلیت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر انھیں اپنے مزعومات کے رنگ میں ڈھال کر عوام کے سامنے پیش کرنا شروع کیا وہ عقل جو خادمِ وحی و نقل بنا کر دنیا میں اتاری گئی تھی اسے اصل قرار دے کر وحی الٰہی کی مرادوں میں ناجائز تصرفات ہونے لگے جس سے اس باغی عقل کی بدولت مختلف فرقِ باطلہ روافض، خوارج، قدریہ جبریہ اور معتزلہ نے جنم لیا اور دین کے نام پر کتنی ہی پارٹیاں بن گئیں جنھوں نے فتنۂ شکوک و شبہات کے بند سوت کھول دیئے اور امت کو جدال و نزاع کا شکار بنا دیا اس لیئے اکابر سلف نے بالآخر عقائد و اصولِ دین کی معقولیت کا پہلو واشگاف کرنے کے لیئے قدم بڑھایا اور اصولِ دین کی گہرائیوں پر تا بحدِ ضرورت حکمت کے نقطۂ نظر سے روشنی ڈالنے کی راہیں ہموار کر دیں جو دین میں پہلے سے مرکوز تھیں۔

لیکن زیغ آور قلوب کی وجہ سے یہ فتنہ اسی حد پر نہیں رہا بلکہ آگے بڑھا اور جدید پارٹیوں نے امہات عقائد و کلیات سے گذر کر جہات مسائل میں بھی جنھیں فروعی عقائد کہنا چاہیئے وحی کے متوارث مفہومات سے الگ ہو کر اسی سرکش عقل کے بل بوتہ پر رخنہ اندازی جاری رکھی جس سے اور بھی بہت سے اسلامی مسائل ان کے فلسفیانہ

مطاعن کی زد میں آ گئے تو ارباب کلام کا طبقہ پیدا ہوا شیخ ابوالحسن اشعری اور شیخ ابومنصور ماتریدی جیسے ائمہ کلام آگے آئے اور انھوں نے وحی الٰہی کی روشنی میں فلسفہ کا بھرپور مقابلہ کرتے ہوئے عقائد و مسائل کو عقلی لباس میں دنیا کے آگے رکھا جس سے عقل کے مرعوبوں کی شک اندازی کی راہیں بہت حد تک مسدود ہو گئیں اور متوارث اور منقول دین رکھنے والوں کے مقابلہ میں مبطلوں کے یہ عقلی ہتھیار بے کار ہو کر رہ گئے گو یہ فرقے نہیں مٹے مگر فرقے ہی سمجھے گئے اور انھیں اصل جماعت کا کٹا ہوا حصہ ہی شمار کیا گیا پس جس طرح علماء حق نے نقل و روایت کے میدان میں وضاعین حدیث تلبیس کنندگانِ روایات کی روایتی دسیسہ کاریوں کے پردے چاک کر کے رکھ دیئے تھے اسی طرح اس درایتی میدان میں ان مدعیانِ عقل کی معنوی تحریفات جاہلانہ تاویلات اور دروغ بافیوں کی قلعی بھی کھول کر رکھ دی اور ان کی نارسا عقلوں کے وہمیات کو عقل صفا کی حقیقی روشنی سے شکست دی جس سے ایک طرف اگر یہ تخریبی جماعتیں تھک کر مایوس ہو گئیں تو دوسری طرف عقائد و مسائل کے ان حکیمانہ عقلی دلائل سے ایمان والوں کے ایمانوں کی بصیرت میں ترقی اور اضافہ ہو گیا لیکن فتنہ شبہات کی جڑیں بہر حال قائم ہو چکی تھیں جو قائم رہیں مختلف فرقوں و پارٹیوں کی زیر سرپرستی ان فتنوں نے اصلیت کی صورت پیدا کر لی اور یہ مختلف مکاتیب خیال نئے روپ کے مکاتیب و مدارس میں مستقلاً زیر بحث لائے جانے لگے۔ اس لئے فلسفہ مزاج پارٹیوں نے یہ سوچ کر کہ اب وہ اہل حق کے مقابلہ میں کون سا حربہ استعمال کریں خالص اصولی عقائد کا میدان چھوڑ کر اسلام کے عمومی مسائل میں ان فتنوں کا گدلا پانی پھیلانا شروع کر دیا یعنی عام دینی مسائل میں اس عقلی تگ و تاز سے انکار و تشکیک کے فتنہ کا آغاز ہو گیا تا کہ اہل حق کو نفس دین ہی سے بدظن بنا دیا جائے اور وہ بالآخر ان ہی نوخیز پارٹیوں

کے دامن میں پناہ لینے پر مجبور ہو جائیں تو ارباب حکمت و معرفت و مفکر قسم کے ارباب فضل و کمال آگے آئے اور انھوں نے اسلام کے تمام اہمات مسائل پر حکیمانہ اسلوب اور عاقلانہ انداز سے کلام کیا، عام اسلامی مسائل کے اسرار و نکات پر عقلی دلائل سے بحث کی اور مسائل کی حقیقت کھول کر فلسفہ کا تار و پود بکھیر دیا۔ امام رازیؒ، امام غزالیؒ، امام خطابیؒ، ملک العلماء شیخ عزالدین ابن عبدالسلامؒ اور ابن عربیؒ جیسے عرفاء اور دانشوران حکمتِ دین کھڑے ہوئے اور انھوں نے دین کی حقائق و مصالح کو عقلی براہین سے پیش کر کے نہ صرف دین کی حدود ہی کو مضبوط کیا اور نہ صرف دین کے ہزار ہا مخفی اسرار اور مستور گوشے ہی اپنی دوربین عقلوں سے کھول کر دنیا کے سامنے رکھ دیئے بلکہ عقلی مباحث کے لیے مستقل بنیادیں ہموار کر دیں۔ امام رازیؒ نے اپنی مستقل تفسیر کا موضوع ہی تفسیر بالدرایۃ اور تفسیر بالمعقول رکھا اور قرآنی آیات کے عقلی پہلوؤں کو انکشاف کرنا قرار دیا۔ امام غزالیؒ نے تہافت الفلاسفہ لکھ کر اصولی طور پر سرے سے فلسفہ ہی کی بنیادوں کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا جس سے شک اندازوں کے گروہ پر کاری ضرب پڑی اور انہیں سوچ پیدا ہوئی کہ وہ اب اہل حق کے مقابلہ میں کون سا حربہ اختیار کرے۔ انھیں حیرانی تھی کہ اہمات عقائد، مہات مسائل آیاتِ قرآن اور روایت حدیث کے تمام دائروں میں تو عقلِ معاد عقلِ معاش کو شکست فاش دے چکی ہے تو آخر اب ان مایوسانِ عقل و دین کے بقاء کی کیا تدبیر ہے؟

اس لیے آخر کار انہوں نے اہمات مسائل کا میدان چھوڑ کر فروعی مسائل میں اپنے وہم و شک کا گدلا پانی بہانا شروع کر دیا جس سے مسائلِ فقہیہ میں انکار و تشکیک کے فتنہ کا آغاز ہو گیا، مسائل فرعیہ کی غیر معقولیت، انفرادی استبداد یا ائمہ تفقہ کے

فروعی اختلافات کو تخریبِ دین دکھلانے کے اتہامات سے اسلامی فقہ کو بے اعتبار بنانے کی مہم شروع کر دی تاکہ اہلِ حق اگر اصول سے نہیں ہٹے تو کم از کم اس حیلہ سے عملی فروعات ہی پر سے ہٹ جائیں حتی کہ فقہی مسالک کے اختلافات کو بصورتِ نزاعات اجاگر کر کے جدال و قتال کے فتنے کھڑے کیے تاکہ امت کمزور پڑ جائے اور اہلِ حق مغلوب ہو جائیں۔ بنیاد وہی ایک تھی کہ انھوں نے عقل کو نقل پر حاکم مان کر مسائل کا فیصلہ بنی جزوی عقلوں کے تحت رکھا تاکہ اگر اصول کو مضمحل کرنے میں وہ کامیاب نہیں ہوئے تو کم از کم فروعات فقہیہ ہی کو ناقابلِ التفات بنا دیں تاکہ اہلِ حق پر یہ الزام عائد کیا جا سکے کہ وہ خلافِ عقل اور خلافِ قیاس راہوں پر چل رہے ہیں، ور ان کا پورا دین معاذ اللہ غیر معقول اور ناقابلِ قبول ہے لیکن انھیں اس کا پتہ نہیں تھا کہ اس پورے دینِ فطرت میں عقلِ کلی بطور روح کے دوڑی ہوئی ہے اور جیسے وہ بے ریب طریقہ پر نقلِ صحیح کے ساتھ دنیا میں آیا ہے ویسے ہی عقلِ سلیم کی روشنی بھی ساتھ لے کر آیا ہے اور اس میں فہم و بصیرت اور عقل و فراست کے ایسے جوہر فرد موجود رہتے آرہے ہیں جو اس دین کی معقولیت سے ناشتی عقلوں اور خرضی دینوں کی قلعی کھول سکتے ہیں چنانچہ فقہی مسائل پر زد پڑتے دیکھ کر اربابِ فقہ آگے بڑھے اور انھوں نے فقہی فروعات اور استنباطی مسائل میں جہاں نقول کے آخذ پیش کیے وہیں عقلی دلائل کو بھی ان کے دوش بدوش لا کر کھڑا کر دیا۔ ہدایہ اور بدائع الصنائع جیسی لطیف کتابیں معرضِ وجود میں آئیں جن میں ہر ہر فقہی مسئلہ کے لیے دلائلِ نقلیہ کے ساتھ دلائلِ عقلیہ کا عظیم ذخیرہ بھی فراہم کر دیا گیا جس سے فقہی فروعات اور استنباطی مسائل میں بھی نصوصِ فقہیہ کے ساتھ عقلی براہین کی تدوین کا آغاز ہو گیا اور بابِ دین میں علی الاطلاق

نقول کے ساتھ عقلی استدلال کی راہیں ہموار ہوگئیں حتیٰ کہ رفتہ رفتہ دین میں عقلی مصالح اور اسرارِ دین نے ایک مستقل موضوع کی شکل اختیار کرلی، جس سے معاندینِ دین اور فرقِ باطلہ کا یہ خیال کلیۃً غلط ثابت ہوگیا کہ دین عقلی مصالح سے خالی یا عقلی استدلال سے عاری ہے، ساتھ ہی وہ اس سے بھی مایوس ہوگئے کہ محض اپنی عقلی وسوسہ اندازیوں سے وہ بابصیرت ایمان داروں کے ایمانوں پر کوئی ڈاکہ ڈال سکیں گے جس سے وہ تردّد میں پڑکر اپنے ایمانی موقف سے ہٹ جائیں لیکن یہ تمام عقلی براہین ابھی تک اپنے اپنے مسائل کے ضمن میں منتشر تھے اور جس فن کا جو مسئلہ بھی مدعیانِ عقل کے یہاں ہدف بنا اسی فن میں اربابِ فن نے اس مسئلہ کو دلائلِ عقلیہ کے ساتھ ثابت کرتے ہوئے مخالف تہامات کو رد کردیا جس سے یہ معقول دلائل مختلف فنون میں بذیلِ مسائل بکھرے ہوئے تھے اور اپنے اپنے متعلقہ مسائل کے سلسلہ سے مختلف فنون میں جمع ہوتے رہے خود اُن کا اپنا کوئی مستقل فن نہ تھا کہ اس میں اپنے اصول وقواعد کے ساتھ مرتب طریق پر جمع ہوں اور ایک منظم فن کی صورت اختیار کرکے انضباط کے ساتھ مدافعت یا حملہ کرسکیں جس کی وجہ یہ تھی کہ وسوسہ اندازوں نے بھی وسوسہ اندازی کو کسی مستقل فن کی حیثیت نہیں دی تھی وہ صرف اپنے مزعومات کے ضمن میں اپنے مفہوم کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے اہلِ حق کے مفہوم کو غیر معقول ثابت کرنے ہی پر اپنی ہمت صرف کرتے رہے اس لیے اہلِ حق بھی ان کے جواب میں انہی مسائل کی حد تک عقلی دلائل دیتے رہے جو مختلف فنون میں بذیلِ مسائل جمع ہوتے رہے اور انھوں نے اسرارِ دین یا حکمتِ اسلام کو کسی مستقل فن کی صورت میں لانے کی ضرورت محسوس نہیں کی، اس لیے اسرارِ دین موضوعِ دین تو بن گیا مگر فن نہیں بنا۔

آخر کار متاخر طبقہ میں حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہٗ کا ظہور ہوا جبکہ یورپ اپنے الحادی ہتھکنڈوں کے ساتھ اُبھرنے کے مقام پر آ رہا تھا۔ ہندوستان کے بیں و نہار بدل رہے تھے۔ دینی لائنوں میں خود رائی اور عقل پرستی کی گھٹائیں ٹوٹ پڑی تھیں اور وقت آ رہا تھا کہ یہ سیاہ بادل برس پڑیں اور دنیا کو سیلِ الحاد و دہریت میں بہالے جائیں تو آپ نے اپنی فراستِ باطنی سے ان مقدمات کو سامنے رکھ کر آخری نتیجہ سمجھ لیا اور دیکھا کہ فلسفیت کی داغ بیل پڑ چکی ہے نہ صرف یہی کہ اس ملک کی دنیا دین کی استدلالی لائنوں میں نقلی دلائل پر قناعت کرنے کے لیے تیار نہیں بلکہ اسلام پر شکوک و شبہات کا وار کرنے کے لیے یہ عقلی سفسطے یکسر مستقل فن کی صورت اختیار کرتے جا رہے ہیں جن کے آثار کم و بیش نمایاں بھی ہو چکے ہیں اس لیے انھوں نے اپنے قلبِ صافی کی مخفی آواز بلند کرتے ہوئے فرمایا کہ:-

وان الشریعۃ المصطفویۃ	اور شریعتِ مصطفوی اس زمانہ میں
اشرقت فی ھذا الزمان	اس پر اُبھر رہی ہے کہ وہ (عقلی) حجت و
علی ان تبرز فی قمص سابغۃ	براہن کی مکمل اور مطابق بدن قمیصوں
من البرھان (حجۃ اللہ البالغۃ)	میں نمایاں ہو۔

آپ نے دیکھا کہ مسلمانوں میں ایک طبقہ معتزلہ کا خلفِ رشید بن کر سامنے آ رہا ہے جو دین پر عقل کی حکمرانی کا قائل ہے اور نصوصِ شرعیہ کو عقل کی کسوٹی پر پرکھے بغیر ماننے کے لیے تیار نہیں اور نہ اُن پر ایمان لانا ہی ضروری سمجھتا ہے بالخصوص دین کے اُن غیبی حقائق پر جو عقول سے بالاتر اور مشاہدہ سے ماوراء بھی ہیں اس لیے آپ نے اس فتنہ کے دفعیہ اور استیصال کے طریقوں پر غور کرتے ہوئے فرمایا:-

ولاسبیل الی دفع هذه المفسدة الا بان تبین المصالح ونؤسس لها القواعد کما فعل نحو من ذلك فی مخاصمات الیهود والنصاری والدهریة واشباههم۔ (حجۃ اللہ البالغہ ص)	اور اب اس مفسدہ کے دفعیہ کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ دین کے (عقائد و اعمال کی عقلی) مصلحتیں بیان کی جائیں اور ان کے لیے (بطور فن کے) قواعد وضع کیے جائیں جیسا کہ یہود و نصاریٰ دہریہ اور ان جیسے دوسرے فرقوں کے مقابلہ میں ایسا ہی کچھ کیا جا چکا ہے۔

اس لیے آپ نے دین کے سلسلہ میں عقلی دلائل و براہین کو ایک فن کی صورت سے مدوّن فرمایا، اس کے اصول و مقاصد وضع فرمائے اور اسے فن کی صورت دیتے ہوئے اس فن میں جلیل القدر کتاب حجۃ اللہ البالغہ تصنیف فرمائی جس میں ابواب و فصول کے تحت فن اسرار کے قواعد و ضوابط اور اصول و قوانین وضع فرما کر ہر باب میں اس کے مناسب عقلی دلائل و براہین کا ایک عظیم ذخیرہ مہیا فرمایا۔

اس مقدس کتاب نے حقیقت یہ ہے کہ بندگانِ عقل کی کمر توڑ دی اور ان کے لیے بندگانِ عقل بننے کے بجائے بندگانِ خدا بننے کا راستہ ایسے مؤثر انداز سے کھول دیا کہ یا وہ اس پر چلیں یا سکوتِ عجز کے ساتھ اپنے غم و غصہ کو دبائے بیٹھے رہیں اور ختم ہو جائیں۔ آپ نے فنی طور پر ابواب دین میں عقل و نقل کا صحیح مقام واضح فرماتے ہوئے ان دونوں کی باہمی نسبت اور حقیقی توازن کی صورت واضح فرمائی۔ آپ نے عقل سے کسی عقیدہ کا استفادہ کرنے کے بجائے اسے عقائد و احکام شرعیہ کے لیے مؤید مثبت اور دشمنانِ حق پر الزام قائم کرنے کا ایک وسیلہ قرار دیا جس سے

نقل کی عظمت و حکومت اور عقل کی اس کے حق میں خدمت گاری پوری طرح نہ منکشف ہوگئی، اُنھوں نے مدعیانِ عقل کو یہ تاثر دیا کہ جو چیز اُن کے یہاں خدائی کا درجہ رکھتی ہے یعنی عقل وہ ان کے یہاں یعنی دین محض ایک خدمتگار اور چاکر کی حیثیت رکھتی ہے اور پھر اُس کے تحت مسائل میں اُس کے نمونے ظاہر فرمائے جس سے بہت سی جزوی عقلوں کو ندامت کے ساتھ پیچھے ہٹنا پڑا لیکن اس کے بعد تیرھویں صدی میں جبکہ یورپین قومیں ہندوستان میں برسرِ اقتدار آگئیں اور اپنی ساتھ فلسفۂ جدید اور سائنس کی ترقیات سے کرنمایاں ہوئیں مشینی دور کا آغاز ہوا مشینری نے دنیا کے دل و دماغ پر قبضہ کرلیا۔ کھانا پینا، دینا لینا، لباس، اور وسائلِ معاش، سفر اور حضر، سواری اور مراکب، تجارت زراعت صنعت و حرفت، جنگ و صلح حتی کہ مکانوں کی ہوا اور پانی، دوا اور غذا، آور دل کا سننا اور سنانا، تقریر اور خطابت، غرض ساری زندگی اور وسائلِ زندگی مشینی لائنوں پر رواں دواں ہونے لگی، تار اور فون پر خبریں دوڑنے لگیں، ریل، موٹر اور اسٹیمر میں بحر و بر کی مسافتیں طے ہونے لگیں۔ وسائلِ حیات فیکٹریوں اور ملوں میں ڈھلنے لگے، دُور دراز کے انسان ٹیلی ویژن کے برقی پردوں پر نمایاں نظر آنے لگے، ہزارہا میل کی مسافت کے باوجود ایک ملک دوسرے ملک کے آمنے سامنے کھڑا ہوا۔

خلاصہ یہ کہ بحر اور بر اور خلاء و فضا سب ہی مشینوں کی زد میں آگئے۔ پھر ساتھ ہی سائنس نے مادّہ کے ہزارہا سربستہ راز دنیا کے سامنے کھول کر رکھ دیئے جس سے دنیا مخفی اور پنہاں چیزوں کا مشاہدہ کرنے کی عادی ہوگئی۔ بالفاظِ دیگر فلسفۂ جدید اور سائنس کے نئے نئے انکشافات سے جن کی بنیاد مشاہدات پر تھی، دنیا عقلی

نظریات اور معقولات سے گذر کر محسوسات کی گرفت میں آ گئی تو قدرتی طور پر پرانے نظریات میں انقلاب رونما ہوا۔

اس لیے اب وہی عقل پرست طبقہ حس پرستی کا شکار ہوا اور اس دور کی دنیا نظریاتی استدلال سے زیادہ حسیاتی اور مشاہداتی استدلال کی لائنوں پر آ گئی، اب اُس کے یہاں کوئی شرعی دعویٰ اُس وقت تک قابلِ سماعت نہیں رہا جب تک کہ وہ معقولات کے ساتھ محسوس شواہد سے محسوس کر کے نہ پیش کیا جائے اور روحانی معتقدات کی پشت پر مشاہداتی حجتیں نہ ہوں۔

بنابریں اسی خوگر محسوس طبقہ نے اسلامی حصار پر عقلی نظریات کے بجائے حسی مشاہدات اور طبعیاتی افکار سے حملے کرنے شروع کر دیئے۔ اس لیے ضرورت تھی کہ اب اسلامی مسائل کو نظریاتی لباس سے ملبوس کرنے سے زیادہ طبعیاتی رنگ کی قمیصوں میں ملبوس کر کے پیش کیا جائے اور طبعیاتی شکوک و شبہات کا جواب انہی طبعیاتی انکشافات کے اصول سے دیا جائے۔

تو اس صدی کے اوائل میں حق تعالیٰ کی فیاض قدرت نے شمس الاسلام حجۃ اللہ فی الارض حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ بانی دارالعلوم دیوبند کو اس دور کے طبعیاتی رنگ کے امراض اور جراثیم کے معالجہ کے لیے بطور طبیب اور مصلح امت کے نمایاں فرمایا اور آپ نے اپنی تقریر اور تحریر کے ذریعہ ان بندگانِ سائنس و مشاہدات کے دماغوں کو انہی کے مسلمات سے جھنجھوڑا اور اُن کے دماغوں کا تنقیہ شروع فرمایا

حکمتِ قاسمیہ کے تمام اجزاء نے (جو حضرت والا کی تصانیف میں موتیوں کی

طرح بکھرے ہوئے ہیں، جہاں اسلامی حقائق پر گہری رلیّاتی اور خالص عقلی دلائل کی روشنی ڈالی وہیں وہ پورے زور اور قوت کے ساتھ ان حقائق کو آج کے محسوسات اور دورِ حاضر کے حسّی شواہد و نظائر سے بھی مدلّل کر کے اس طرح پیش کیا کہ اسلام کے غیبی امور، شریعت کے بنیادی مقاصد اور دینِ فطرت کے مبانی و اصول اس حسیاتی رنگِ استدلال سے بالکل طبعی اور محسوس و مشاہد نظر آنے لگے۔ ذات و صفاتِ خداوندی، مبداء و معاد، توحید و رسالت، عقائد و شرائع، برزخ اور قیامت، سزا و جزاء، حشر و نشر، وزنِ اعمال، میزانِ عمل، جنت و نار، ملائکہ و جنات، عرش و کرسی، لوح و قلم وغیرہ ان عقائد اور اُن سے متعلق اعمال کا صفاتِ خداوندی سے ربط و علاقہ، کلیاتِ دین کے ساتھ فرعیات کا ارتباط پھر شرائع و عقائد کی عقلی اور طبعی مصالح اس طبعیاتی طرزِ استدلال سے کچھ اس طرح واشگاف فرمائے کہ یہ سب امور فطرت اور طبیعت کا مقتضا محسوس ہونے لگ گئے جس سے اور اندازہ ہوتا ہے کہ حضرتؒ والا ان حقائق کو محض نظری دلائل کے زور سے جبری طور پر ذہن میں ٹھونسنا نہیں چاہتے بلکہ یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ دین کے یہ تمام عقائد و احکام فطرۃ و طبیعت کا تقاضا ہیں جن کا وجود اسی طرح قابلِ تسلیم ہے جیسے چمکتے ہوئے سورج کا وجود جس سے ایک فہیم، انسان جبری انداز سے نہیں بلکہ طبعی تقاضوں سے انہیں ماننے اور تسلیم کرنے کے لئے بطوع و رغبت جھکنے کے لیے تیار ہو جائے، حضرتؒ والا کے اس نئے طرزِ اثبات سے اس پورے دین کا محض دینِ عقلی ہونا ہی نہیں بلکہ دینِ فطرت ہونا نمایاں ہو جاتا ہے جیسا کہ حضرت والا کی کتابوں میں اُن کی تقریراتِ استدلال سے واضح ہو گا۔

ساتھ ہی حیرت ناک بات یہ ہے کہ حضرتِ والا کا یہ علم بلاشبہ لدنی ہے ورکی یا کتابی نہیں، نہایتی و وجدانی ہے جس کا بظاہر دوسروں کے وجدان کے لیے حجت ہونا ضروری نہیں تھا۔ لیکن آپ کا طرزِ بیان خالص استدلالی و منطقی ہوتا ہے جو مطیع و منکر دونوں کے لیے یکساں حجت ہو۔

حقائق سب کی سب منقول لیکن پیرایۂ بیان بلاحوالۂ نقل خالص معقول اور اس کے ساتھ فلسفیانہ اور سائنٹفک گویا عقل و طبع دونوں کو صحیح معنی میں حضرت نے دین کا ایک خدمت گار بنا کر دکھلا دیا ہے کہ فلسفہ اور سائنس کا کان پکڑا اور دین کے جس جس گوشے کی چاہی اُن سے خدمت لے لی، جس سے دین کی نسبت سے عقل و طبع دونوں کا موقف بھی خود بخود کھل کر سامنے آجاتا ہے۔

اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ مضامین نہایت بلند پایہ، بہت گہرے اور علوم نہایت دقیق اور غامض ہیں لیکن طرزِ بیان نہایت شگفتہ اور سہل ہی نہیں بلکہ سہلِ ممتنع۔ مقدمات کی ترتیب ایسی کہ اہم سے اہم نتیج گویا خود بخود نکلنے کے لیے اُبھر رہے ہیں۔ تقریر استدلالی نہایت مرتب جو ذہن کو پیل کرتی ہوئی اس کی گہرائیوں میں اُترجاتی ہے اور ساتھ ہی حضرت والا کا شلخ درشلخ بیان مسئلہ کے تمام شقوق و جوانب پر اتنا حاوی اور اُس کے تمام گوشوں کا اس درجہ واشگاف کنندہ ہوتا ہے کہ اس سے صرف وہی ایک زیرِ بحث مسئلہ حل نہیں ہوتا بلکہ اس کے سیکڑوں امثال جو اس کی زد میں آجائیں، خواہ وہ کسی دوسرے ہی باب کے ہوں اس اصولی طرزِ بیان سے حل ہوتے چلے جاتے ہیں بلکہ قلوب پر کتنے ہی علوم و معارف کے دروازے کھلتے جاتے ہیں جن سے نئے نئے مسائل کا

راستہ بھی ہموار ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس صورتِ حال سے آدمی یہ ماننے پر مجبور ہوتا ہے کہ شریعت کے اس جزیہ کی پشت پر عقلی کلیات کی کس قدر کمک موجود ہے اور کتنے کلیے، وہ عقلی اصول اس ایک جزیہ میں اپنا عمل کر رہے ہیں جس سے وہ عقلی ہی نہیں طبعی نظر آنے لگتا ہے۔ بقول حضرت عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ اولین صدر مدرس دار العلوم دیوبند کہ:

"حضرتِ والا کے دماغ کی ساخت ہی خلقی طور پر حکیمانہ واقع ہوئی تھی، اس لئے بلا اختیار اُن کے دماغ میں حکمت ہی کی باتیں آسکتی تھیں جس سے ان کے یہاں جزوی مسائل کا کلام بھی کلیاتی رنگ اختیار کر کے ایک کلیہ بن جاتا تھا اور اُس سے وہی ایک جزیہ نہیں بلکہ اُس جیسے سیکڑوں جزیئے حل ہو جاتے تھے اور اوپر سے ان کا وہ کلی اصول کُھل جاتا تھا جس سے اس جزیہ کا نشو و نما ہوا ہے"۔

بعض ایسے جزوی مسائل جنہیں فقہاء امت خلافِ قیاس امر تعبدی کہہ کر گذر گئے ہیں حضرت والا کے یہاں وہ بھی قیاس جلی سے پیدا شدہ عقلیاتی ہیں چونکہ آپ کے نزدیک شریعت کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا اور جزوی سے جزوی مسئلہ بھی غیر قیاسی یا مخالفِ عقل تسلیم نہیں کیا گیا ہے مثلاً قہقہہ کا ناقضِ وضو ہونا تمام فقہاء کے نزدیک ایک خلافِ قیاس اور بالفاظِ دیگر غیر عقلی ہے اس لیے وہ اُس کی کوئی عقلی دلیل نہ پاکر اُسے تعبدی کہتے گئے ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ عقل کے خلاف محض ایک امرِ شرعی ہے جسے صرف بوجہ ایمان ہی تسلیم کیا جائے گا لیکن حضرت والا نے اُسے بھی عقلی قرار دے کر اس پر عقلی دلائل پیش فرمائے ہیں، اور بتلایا ہے کہ جس کلیہ سے

یہ جزیہ پیدا ہوا ہے جب وہ عقلی ہے تو جزیہ کے غیر معقول ہونے کے کوئی معنی نہیں ہو سکتے جیساکہ اپنے موقعہ پر اس کا تفصیلی بیان آئے گا۔

بہرحال شرعی جزئیات کو ان کے عقلی کلیات کی طرف راجع کرنا اور کلیات سے نادر جزئیات اور مقاصد دین کا استخراج کر لینا یا متعدد جزئیات کے تتبع و استقراء سے ایک کلی اصول قائم کر کے ہزاروں جزئیات کا اُس سے فیصلہ کر دینا آپ کا خاص علم اور علم کا خاص امتیازی مقام ہے۔

اس سے بھی زیادہ عجیب اور حیرت ناک یہ ہے کہ عاشۃ قیاس واستنباط کا تعلق احکام سے ہوتا ہے نہ کہ اخبار اور واقعات سے عقلی طور پر یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ حکم معقول ہے لیکن عقلی استدلال سے یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ واقعہ معقول اور عقلی ہے اور اُسے عقلاً بھی یوں ہی ہونا چاہیے تھا لیکن حضرت والا کے یہاں شرعی واقعات بھی اصول عقلیہ سے باہر نہیں ہیں اور آپ کا خداداد علم اور فراست اخبار اور واقعات کی عقلی لمیات میں بھی اُسی طرح کام کرتا ہے جس طرح وہ احکام و اوامر و نواہی کی حقائق بیانی میں کار فرما ہے۔

ظاہر ہے کہ واقعات اور حوادث کو کسی عقلی اصول سے جوڑ کر یہ دعویٰ کرنا کہ یہ واقعہ عقلاً بھی یوں ہی پیش آنا چاہیے تھا جس طرح کہ وہ واقعہ پیش آیا، بلاشبہ علم و فراست اور قلبی ذکاوت کی ایک نادر مثال ہے۔

دنیا میں کعبہ معظمہ (بیت اللہ) کا وجود اُن کے یہاں محض تکوینی نہیں بلکہ عقلی بھی ہے یعنی بیت اللہ عقلاً بھی اُسی محل میں ہونا چاہیے تھا جس میں وہ واقع ہے پھر بیت اللہ کا اوّل بیت ہونا جو قرآنی دعویٰ ہے اُن کے یہاں محض تاریخی نہیں بلکہ

عقلی بھی ہے کہ اُسے عقلاً بھی اول بیت ہی ہونا چاہیئے تھا جیسا کہ وہ ہے حتیٰ کہ بیت اللہ کے چالیس سال بعد مسجد اقصیٰ کی بنیاد رکھے جانے کی یہ لطیفی مدت بھی عقلی ہے کہ قصیٰ کی تاسیس عقلاً بھی کعبہ کے چالیس ہی سال بعد ہونی چاہیئے تھی۔

اس سے بھی عجیب تر یہ کہ کعبۂ محترمہ اور مسجد اقصیٰ کا درمیانی فاصلہ جو تقریباً ڈھائی تین سو میل ہے یہ بھی اُن کے اصول پر عقلی ہے محض تاریخی یا جغرافیائی نہیں صرف اس لیئے کہ وہ شرعی دعویٰ ہے اور ان کے اصول حکمت میں شریعت کا کوئی دعویٰ مخالف عقل قیاس نہیں ہو سکتا چنانچہ قبلہ نما میں اس کی تفاصیل دیکھی جاسکتی ہیں

قرآن حکیم نے کائنات کے مشاہدات زمین، آسمان، چاند، سورج، ستارے، دریا، پہاڑ، جمادات، نباتات اور ہواؤں کی شمالی، جنوبی رفتاروں سے بہت سے غیبی حقائق پر استدلال کیا ہے جو بلاشبہ فطری اور طبعی طرز استدلال ہے، حضرت نے ان مکونات کے اندرونی مکونات کی گہرائیاں طبعی انداز میں کھول کر ان استدلات کو عقلی سے زیادہ طبعی بنا دیا ہے اس اصول پر کہ یہ خدا کے افعال ہیں اور اس کے افعال سے زیادہ اور کس کے افعال فطری ہو سکتے ہیں۔ آپ نے بدلائل واضح کیا ہے کہ قرآن کے یہ استدلالی مقدمات کن کن گہری اور فطری حقائق کو اپنے اندر لیئے ہوئے ہیں جن سے یہ مسائل ثابت ہو رہے ہیں اس لیئے قرآن کے یہ سب مسائل محض عقلی ہی نہیں بلکہ سائنٹفک بھی ہیں۔ مثلاً قرآن حکیم نے عالم کے جزئیاتی تغیرات سے قیامت کے ثبوت پر استدلال کیا ہے جو اس کا مخصوص شرعی انداز ہے، حضرت نے اُسے کھولتے ہوئے کہا ہے کہ جب عالم کے یہ جزئیاتی تغیرات طبعی اور سائنٹفک ہیں جو سائنس کا دعویٰ ہے تو عالم کا کلی تغیر یعنی مجموعۂ

عالم کی موت بھی طبعی ہے جسے قیامت کہتے ہیں پس قیامت کو عقلی دلائل سے الگ ثابت کیا ہے جو فلسفہ کا موضوع ہے اور طبعی اور مادی شواہد سے الگ نمایاں کر دیا ہے جو سائنس کا موضوع ہے۔

اس طرزِ استدلال سے جہاں تکوین و تشریع کے مسائل طبعی مذاہب میں ثابت ہوتے ہیں وہیں ان حقائق اور دقائق سے قرآنِ حکیم کا معجزہ ہونا بھی نمایاں ہوتا ہے کہ خدا ہی کے کلام میں ایسی گہرائیاں ہو سکتی ہیں اور ظاہر ہے کہ اس سے بلا شبہ مومن کا قرآنِ حکیم پر ایمان نہ صرف تازہ بتازہ بلکہ علی وجہ البصیرۃ ہو جاتا ہے جو مقصودِ اصلی ہے۔ اور ان عقلی اور طبعی حقائق کے کھلنے سے ہی ممکن ہے۔

اس سے واضح ہے کہ قرآنی حقائق جب اس عقلی اور طبعی انداز سے سامنے آئیں اور جبکہ وہ کسی دور میں بھی خلافِ واقعہ نہیں ثابت ہوں گے اور نہ ہو سکتے ہیں تو یہ محض اعجازِ قرآن ہی کی بیّن دلیل نہ ہوگی بلکہ اس پر لائے ہوئے ایمان کی مضبوطی کی بھی یک مستقل حجت ہوگی جو حقائق بیانی کا ایک زبردست اور عظیم مفاد ہے کہ ایمان علی وجہ البصیرۃ ہو جائے جو حقیقتاً ایمان کے تحقیقی ہو جانے کی صورت ہے اب اگر یہی حقائق اغیار کے سامنے آ جائیں تو عقلاً کوئی وجہ نہیں رہتی کہ وہ ایمان لانے کی طرف نہ جھکیں، البتہ تعصب و عناد دوسری بات ہے جو زیرِ بحث نہیں ہے۔

بہر حال حکمتِ قاسمیہ میں بیک وقت عقلی اور طبعی دلائل ساتھ ساتھ چلتے ہیں تاکہ ایک طرف اگر دینی مقاصد کا اثبات فطری طور پر عقلی رنگ میں ہو تو دوسری طرف اُن کا ثبوت حسی اور مشاہداتی طور پر طبعی رنگ میں بھی ہو اور اس طرح آپ نے دین کے اثبات میں نظریاتی اور حسیاتی دونوں طریقے اختیار فرمائے ہیں، بالفاظِ دیگر

مبادیِ فلسفہ اور مبادیِ سائنس دونوں ہی سے خدمت لی ہے تاکہ ایک طرف تفلسف مزاج لوگوں کے شبہات اور اشکالات فلسفیانہ انداز سے حل ہوں اور دوسری طرف مادہ پرستوں کے سائنسی شکوک وشبہات حسیاتی انداز سے مرتفع ہوں کہ جس کے بغیر اس دور کے مادہ پرستوں اور عقل پرستوں کی اصلاح کا دوسرا راستہ نہیں تھا، اس لیئے بے جھجک کہا جاسکتا ہے کہ اس قرن کے یہ عرفاء اور حکماء اور بالخصوص حضرتِ والا اس دور کے مجدد تھے جنھوں نے اپنے اپنے وقت پر اپنے اپنے دائروں میں وقت کے تقاضوں کے مطابق تجدیدِ دین اور اصلاحِ امت کے فرائض انجام دیئے

اس پر بیان کی بلاغت وفصاحت کا یہ عالم ہے کہ آج سے سو برس پہلے کی اُردو کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے حضرتِ والا کے حکیمانہ بیانات کی اردو آج سو برس بعد کی اُردو سے دور نہیں محسوس ہوتی۔ محاورات کا فرق جداگانہ چیز ہے جو حسبِ تقاضائے وقت بدلتے رہتے ہیں لیکن طرزِ ادا اور اسلوبِ بیان آج کے معیارِ ادب کے لحاظ سے بھی اونچے درجہ کی فصاحت اور بلاغت سے گرا ہوا نہیں جس سے آج کا ادیب بھی نہیں اُکتا سکتا۔

مضمون کی بلندی اور حقائق کی گہرائیوں کی وجہ سے اگر کسی قلیل المناسبت یا کم استعداد کو ان عالی مضامین کے سمجھنے میں دشواری پیش آئے تو وہ بیانِ حکمت کا قصور نہیں ہے بلکہ ناظر ومستمع کی علمی استعداد کا قصور ہوسکتا ہے یہی وجہ ہے کہ اُس دور کے مسلم اور غیر مسلم، دبا، اور اردو داں حضرات کے سامنے حکمتِ قاسمیہ کے ادیبانہ اور بلیغ بیانات نفسِ بیان وتقریر کے لحاظ سے بھی اک مثالی درجہ رکھتے تھے جس کا اپنوں اور پرایوں بلکہ دشمنوں کو بھی اعتراف تھا۔

چنانچہ مباحثہ شاہ جہاں پور میں جو عیسائی پادری عیسائیت کے عمومی فروغ کے منصوبے لے کر شریکِ مباحثہ ہوئے، یا جو ہندو اپنے مذہب کی ترویج عام کے جذبات لے کر مجلسِ بحث میں حاضر تھے انھیں حضرت والا کے یہ اعجازی بیانات اور فلسفیانہ اور حکیمانہ تقریراتِ استدلال سن کر سکوتِ عجز کے ساتھ ان بیانات کی تاثیر و تصرف کا لوہا بھی ماننا پڑا، انقیاد و طاعت جداگانہ بات ہے جو توفیقِ الٰہی پر موقوف ہے۔

پادری نیک نے کہا جو مباحثہ شاہ جہاں پور میں شریکِ اجلاس تھے:۔

کیا پوچھتے ہو، ہم کو بہت سے اس قسم کے جلسوں میں شامل ہونے کا اتفاق ہوا اور بہت سے علماء اسلام سے اتفاقِ گفتگو ہوا، پر نہ یہ تقریریں سنیں، نہ ایسا عالم دیکھا، ایک دُبلا پتلا سا آدمی، میلے سے کپڑے، یہ بھی نہیں معلوم ہوتا تھا کہ یہ کچھ عالم ہیں، ہم جی میں کہتے تھے کہ یہ کیا بیان کریں گے؟۔ یہ تو ہم نہیں کہتے کہ وہ حق کہتے تھے (گو اس حق کا جواب دینے اور اپنا مفروضہ حق واضح کرنے سے عاجز بھی رہے جیسا کہ انھیں خود بھی دوسرے مواقع پر اس کا اعتراف کرنا پڑا) پر اگر تقریر پہ ایمان لایا کرتے تو اس شخص کی تقریر پر ایمان لے آتے۔

(میلہ خدا شناسی صد۲)

اسی پادری نیک نے مباحثہ کے آغاز میں علماء اسلام کو پہلو تہی کا طعنہ دیا تھا لیکن حضرت والا کی تقریر سن کر اس طعنہ کے خلاف رطب اللسان تھے۔

مولوی عبدالوہاب صاحب بریلوی نے حضرت والا سے عرض کیا کہ یہ پادری (نیک) بعد اختتام مباحثہ ملنے آیا تھا اور حضرت کی تقریروں کی تعریفیں

کرتا تھا جیسا کہ میلہ خدا شناسی صہ۳ پر یہ تفصیل مرقوم ہے۔

ماسٹر جوئل نے (جو شاہ جہاں پور کالج میں مدرس (پروفیسر) تھے کہا:۔

"مسلمانوں میں ایک ہی عالم دیکھا۔"

(میلہ خدا شناسی صہ۳)

ایک اور پادری سے سید ظہور الدین صاحب شاہ جہاں پوری نے پوچھا تم اُس دن (یوم مباحثہ) میں کچھ نہ بولے، اُنھوں نے کہا کہ:۔

ہم کیا کہتے، مولوی صاحب (حضرت نانوتویؒ) نے کوئی بات چھوڑ دی تھی جو ہم بولتے، ہمارے پادری نولس (جو یوم مباحثہ میں پادریوں کے سربراہ اور قائد تھے) ہی کو جواب نہ آیا

(میلہ خدا شناسی صہ۳)

جانکی داس جوگی نے (جو اس مباحثہ میں شریک جلسہ تھا) خود حضرت والا کو کہا:۔

جب تم نے بولی ماری (تقریر کی)، تو ہم نے دیکھا کہ اُس کا (پادری فنس کا) اتنا سر رہ سوکھ گیا تھا (یعنی روح ہوا ہو گئی تھی)

(میلہ خدا شناسی صہ۳۹)

اسی طرح دوسرے ہندوؤں کے مقولے بھی اس کتاب میں اسی قسم کے نقل کیے گئے ہیں۔ کہا گیا کہ:۔

جب میلہ برخاست ہونے لگا اور سب اہلِ اسلام وہاں سے روانہ ہوئے تو میلہ کے ہندو وغیرہ ان (مناظرانِ اسلام) میں سے حضرت والا کی طرف اشارہ کرکے اوروں کو بتلاتے تھے کہ یہ ہیں یعنی یہ (حضرت والا) ہیں جنھوں

نے پادریوں کو عاجز کیا اور شکست دی۔

(میلہ خدا شناسی ص۳۹)

جانکی داس جوگی نے کہا:۔

جیسے بی موبی (یعنی یہی حضرت والا) ہیں جنھوں نے سچ سب سے اپنا

لوہا منوالیا (میلہ خدا شناسی ص۳۹)

ختم مباحثہ پر حضرت والا نولس کے خیمہ میں خود ملنے تشریف لے گئے اور نصائح فرمائیں۔ فرمایا کہ دینِ عیسوی سے توبہ کیجئے اور دینِ محمدی اختیار کیجئے دنیا چند روزہ ہے۔ عذابِ آخرت بہت سخت ہے۔ پادری صاحب نے کہا بے شک اور چپ ہو رہے اور آخر میں پادری نولس نے کہا کہ:۔

میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے میرے حق میں اتنی فکر کی، اور میں آپ کی اس بات کو یاد رکھوں گا۔ (میلہ خدا شناسی ص۳۸، ۳۹)

بہرحال حضرتِ والا کی صداقت کمال لیاقت اور بیان کی بلاغت غیر مسلموں پر بھی اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہتی تھی، حکیمانہ دلائل اور فلسفیانہ براہین جداگانہ چیز ہے، یہی تقریر و بیان کے تاثرات تھے کہ اگر یہ سننے والے غیر مسلم اگر اسلام نہیں بھی قبول کرتے تھے تو معترفِ حق ضرور ہو جاتے تھے اور اس طرح اُن پر خدا کی حجت تمام ہو جاتی تھی۔

یہ تو اغیار کا قصہ ہے جو عرض کیا گیا لیکن خود مسلمان کہلانے والے ایسے فضلاً بھی جن کی آنکھوں کو فلسفۂ جدید اور سائنس نے خیرہ کر دیا تھا وہ بھی جب یہ بیانات سنتے تھے یا آج علماء دیوبند سے اُن کی ترجمانی کو سنتے ہیں تو وہ نہ صرف مرعوب

ہی ہوتے ہیں بلکہ اُن کے خیالات کی دنیا میں انقلاب بپا ہوجاتا ہے اور وہ سوچ میں پڑ جاتے ہیں کہ ان دلائلِ قاہرہ کے بعد عقائد وافکارِ دین کے بارے میں آخر وہ کس طرح اپنے اس طبعیاتی یا سائنسی موقف کو قائم رکھیں؟ اور کیونکر نہ اعترافِ حق کریں۔

اس حقیر ناکارہ کو خود بھی بارہا اس کا تجربہ ہوا کہ اس قسم کی جس مجلس میں بھی قابل گریجوئٹوں سے خطاب ہوا اور مناسب موقع حضرت والا کے علوم کی ترجمانی کی نوبت آئی تو بارہا یہی اعتراف واقرار کا منظر دیکھنے میں آیا۔ اس سے ہم اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ آج کے دور کے انکار، الحاد اور دہریت وزندقہ کا قرار واقعی استیصال یا دفاع اگر ممکن ہے تو اسی حکمۃ قاسمیہ کی علمی روشنی سے ممکن ہے جو آج کے فلسفہ و سائنس کے مسلّمات و نئے نئے انکشافات ہی کے اصول سامنے لاکر اسلام کی صداقت کا لوہا منوا سکتی ہے، اور جس میں حقیقی طور پر اتمام حجت کی شان موجود ہے۔

یہ حکمت گو بنی معقولیت اور شیوہ بیانی کے لحاظ سے واضح سمیں، اور دلوں میں اُتر جانے والی حقیقت ہے اور اُس کی تاثیرات و تصرفات گو آفتاب سے زیادہ روشن اور غبارِ اور اغیار نہ اپنوں تک پر اثر انداز ثابت ہوئی لیکن پھر بھی مضامین کی دقّت و مستفیدین کی استعدادوں کی قلت بالخصوص جبکہ بے توجہی سے اس کی غلط آمیز طباعت نے اس کی دقت کو اور زیادہ بڑھا دیا ہو کچھ علمی حلقے اُس سے دہشت زدہ نظر آتے ہیں بلکہ ان بلند پایہ اور گہری حقائق کی نسبت سے بعض قلیل المناسبت علماء بھی اس سے بھاگتے ہوئے محسوس ہوئے لیکن حکمت بہرحال حکمت ہے اور مسائل کی نسبت سے گو دلائل مشکل بھی ہوتے ہیں بالخصوص

جبکہ وہ فلسفیانہ اور گہرے حقائق پر مشتمل ہوں لیکن سطح پسند لوگوں کی وحشت سے اہلِ فہم نہ کبھی متاثر ہوئے نہ ہوں گے، اور نہ ہی اُن کی طلب حکمت کی دوڑ کسی دور میں بھی ختم ہوگی۔ کلام کی دقت یا رفعت مقام کا تقاضہ اُسے حل کرنا ہے نہ کہ اُس سے بھاگنا۔ دنیا جانتی ہے کہ اس دقت کے باوجود اُس سے کامیاب ہونے والے کامیاب ہوئے اور انھوں نے ہزاروں کو کامیابی کی منزل تک پہونچایا۔

جماعتِ دارالعلوم اور علماء میں ہزاراں ہزار نکلیں گے جنھوں نے اس حکمت سے سبق لیا لیکن خصوصیت سے جن حضرات کو اس حکمت سے خاص مناسبت اور گرویدگی تھی اُن میں پہلے طبقہ میں حضرت اقدس مرشدی و مرشدِ عالم حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ہیں جن کے درسِ حدیث کا طغرائے امتیاز ہی یہ علوم قاسمیہ تھے، آپ اس حکمت کا ایک نہایت گہرا ظرف اور اُس کے اولین ترجمان تھے، انھیں ان علوم و معارف کے لحاظ سے قاسمِ ثانی کہا جانا ایک واقعی حقیقت ہے، حسبِ روایت حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ آپ نے حضرتِ والا کی بعض ادق کتابیں جیسے آبِ حیات وغیرہ حضرت والا سے درساً درساً پڑھی تھیں اس لیے ان بدیہیاتِ قاسمیہ کی جو ترجمانی آپ فرما سکتے تھے وہ دوسروں سے ممکن نہ تھی۔ دوسرے ترجمانِ حکمت اس طبقہ کے ایک فردِ کامل حضرت اقدس مولانا سید احمد حسن امروہی رحمۃ اللہ تھے جن کی درسی اور غیر درسی تقریریں اسی حکمت سے مملو ہوتی تھیں پھر اسی طبقہ میں تیسرے ترجمان میرے والد ماجد حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے جنھیں اس حکمت کے مضامین پر اس درجہ عبور حاصل تھا کہ وہ حضرتِ والا کی کتب کے صفحہ اور سطر تک کے حوالہ سے یہ مضامین

ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ جلالین شریف، مشکوٰۃ شریف اور مسلم شریف میں جو آخر میں اُن کے درس کی خاص کتابیں تھیں کثرو بیشتر بموقعہ ان علوم کی ترجمانی فرماتے رہتے تھے، راقم الحروف کو جو تھوڑی بہت مناسبت حکمتِ قاسمیہ سے پیدا ہوئی وہ انھیں کے درس کا طفیل ہے جبکہ مشکوٰۃ و مسلم احقر نے انہی سے پڑھی ہیں اور ان میں حضرت مرحوم آیات واحادیث کے مضامین کے اثبات میں اسی حکمت کے اجزا سے کام لیتے تھے جس کا اثر شرح صدر کی صورت سے سینوں پر پڑتا تھا۔ ان کے بعد دوسرے طبقہ میں حضرت علامہ مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ چوتھے ترجمان تھے جنھیں اس حکمت پر پورا عبور حاصل تھا اور انھوں نے یہ علم اوّل کے دو بزرگوں کے درس سے حاصل کر کے اپنے دل کی گہرائیوں تک پہونچایا اور پھر تصانیفِ قاسمیہ کا گہرا مطالعہ فرمایا، اُن کا مقولہ تھا کہ جس کے سننے والوں میں یہ حقیر راقم الحروف بھی شامل ہے کہ اگر میری نظر ان کتابوں پر نہ ہوتی تو نہ معلوم میں اعتزال کے کس گڈھے میں پڑا ہوا ہوتا۔ حضرت ممدوح کے درسِ حدیث و تفسیر کا طغرائے امتیاز یہی علومِ قاسمیہ تھے جنھیں وہ احادیث کے سلسلہ سے درسی تقریروں، نیز اپنے مواعظ وخطبات میں بیان فرمایا کرتے تھے اور یہی اُن کی تقریروں میں جاذبیت کا اِک بنیادی سبب تھا۔ آپ نے اپنی شرح مسلم فتح الملہم میں بالخصوص کتاب الایمان میں بہی تقریرات استدلالی کو انہی علوم سے آراستہ کیا اور ان علوم کو خاص طور پر اس کتاب میں سمویا ہے اور جگہ جگہ حضرتِ والا کے حوالے دیئے ہیں۔

آخر میں حضرت الاستاذ الاکبر حضرت علامہ انور شاہ قدس سرہٗ سابق صدر المدرسین دار العلوم دیوبند بھی اس حکمت کی طرف متوجہ ہوئے اور ان حقائق کی ترجمانی شروع

فرمائی تھی کہ آپ نے طلبہ کی ایک مخصوص جماعت کو خارج اوقات میں شفا شروع کرائی جس میں یہ ناکارہ بھی شامل تھا۔ اس میں جگہ جگہ کلامی مسائل کے ضمن میں حضرت والا کی تقریریں نقل فرماتے تھے اور انہی کے اصول سے فلاسفہ کا رد بھی کرتے جاتے تھے اسی دوران میں حضرت ممدوح نے ایک کلامی قصیدہ بنام حزب الحاتم فی حدوث العالم بھی موزوں فرمایا جس کے حاشیہ میں جابجا حضرت والا کی تصانیف کے حوالوں سے حضرت کے یہ کلامی علوم نقل فرمائے ہیں۔

اس طبقۂ ثانی میں خصوصیت سے حضرت علامہ مولانا عبیداللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ نے تو حکمتِ ولی اللہی اور حکمتِ قاسمی کو اپنا موضوعِ زندگی ٹھہرالیا تھا ان کا نظریہ یہ تھا کہ شاہ ولی اللہ کی کتابوں کا کماحقہٗ فہم اور شعور تصانیفِ قاسمیہ کے مطالعہ کے بغیر میسر ہی نہیں آسکتا اور اسی بناء پر انھوں نے لاہور میں محمد قاسم ولی اللہ سوسائٹی کی بنیاد ڈالی جس کے ذریعہ انھوں نے ان علوم کی اشاعت و ترویج میں پوری ہمت صرف فرمادی۔ مولانا ممدوح نے احقر کی عرضداشت پر دارالعلوم میں اس ناکارہ کو حجۃ اللہ البالغہ بھی پڑھانی شروع کی اور مختلف اوقات میں احقر کے سوالات پر حکمتِ قاسمی اور حکمتِ ولی اللہی کے اصول وحقائق تشریح کے ساتھ نقل فرماتے تھے۔

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی دارالعلوم میں پہنچ کر اپنے اوائلِ ایام میں حضرت والا کی تصانیف میں سے تقریر دلپذیر کا درس شروع کرایا تھا لیکن سیاسی مشاغل کے غلبہ کے سبب وہ نبھ نہیں سکا اور چند ہی اسباق کے بعد ختم ہوگیا۔ آج دارالعلوم کے قدیم اساتذہ میں استاذ الاساتذہ حضرت علامہ مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی مدظلہ العالی اس حکمت کے امین ہیں جو حکمتِ قاسمیہ

پر کافی نظر رکھتے ہیں اور درسِ حدیث میں موقعہ بموقعہ ان علوم کو طلبہ کے ذہنوں تک پہونچاتے رہتے ہیں جس سے دارالعلوم کے علمی حلقہ میں اِک حدتک یہ ذوق موجود ہے۔

حاصل یہ ہے کہ حکمتِ قاسمیہ کتنی ہی دقیق سہی مگر آج کے دورِ الحاد کے گہرے شبہات کا علمی حل بھی اُس کے سوا دوسرا نہیں اس لیے اُس کے دقیق ہونے کا ثمرہ یہ نہیں ہو سکتا کہ ان جواہر ریزوں سے روگردانی یا بے توجہی برتی جائے ورنہ یہ ذکر کردہ طبقہ جو اس حکمت کا حامل تھا پیدا ہی نہ ہوتا بلکہ یہ ہے کہ ان غامض اور نادر علوم سے آج کے ذوق کی سطحیت اور سطح پسندی کا علاج کیا جائے جس کی وجہ سے ذہن اس غامض حکمت سے بعید ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

آج اس کی ضرورت ہے کہ اس حکمت کو نہ صرف یہ کہ اچھے اسلوب سے مرتب اور منضبط کر کے محفوظ ہی کر دیا جائے بلکہ ضروری حدتک تشریح و توضیح اور امکانی حدتک تسہیل و تیسیر سے اُسے دنیا کے ذہنوں سے قریب کرنے کی بھی سعی کی جائے تاکہ یہ دقت و غموض وغیرہ کے عذراتِ بارِدہ لوگوں کے لیے اُس سے ترکِ استفادہ کا حیلہ نہ بن سکیں۔ پھر بھی اگر کوئی اس فطری قرابادینِ دین سے اپنا یا دوسروں کا علاج نہ چاہے تو یہ اُس کی قسمت کی بات ہوگی، تقاضیٔ حکمت کی بات نہ ہوگی۔

اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھ کر مجلس معارف القرآن (اکیڈمی قرآنِ عظیم) دارالعلوم دیوبند نے بنامِ خدا اس حکمت کو اعلیٰ کتابت و طباعت، خوشنما اسلوب تسہیل اور عمدہ ترتیب کے ساتھ علمی حلقوں کے سامنے پیش کرنے کا عزم باندھا

اور عملی قدم اُٹھایا ہے۔ اُس کا عزم اور منصوبہ ہے کہ فوائد و اسرارِ قرآنی پر مشتمل حکمتِ قاسمیہ اور حضرتِ والا کی تصانیف کو ایک خاص ترتیب و تشکیل سے ایک ہی سائز پر سلسلہ کے ساتھ پیش کیا جائے اور ساتھ ہی حضرتِ والا کی تصانیف کے اصل متن کو بحالہ قائم رکھ کر درمیان میں تشریحی نوٹ کے ذریعہ اجمالات کی تفصیل اور اصطلاحی الفاظ کی توضیح کی جائے۔

نیز ہر کتاب کے دقیق مضامین میں حضرت کے بیان سے پہلے اولاً انھیں سہل تعبیر میں سمجھا دیا جائے جس میں اصطلاحی الفاظ نہ ہوں اور پھر حضرتِ والا کے کتابی متن کی اصل عبارت لکھی جائے تاکہ ایک ناظرِ کتاب نفسِ مسئلہ اور مدعا کو پہلے سے سمجھ کر جب حضرتِ والا کا بیان اور اُس کے دلائل و براہین پڑھے گا تو نہ صرف یہ کہ پہلے سے حل شدہ مضمون حضرتِ والا کی عبارت سے بھی اُس کے ذہن میں آجائیگا بلکہ حضرت کی بلیغ اور جامع تعبیرات سے اُس کی حقائق فہمی کا لطف بھی دوبالا ہوجائے گا اور وہ ان حقائق و معارف تک پہونچ سکے گا جہاں حضرتِ والا اُسے پہونچانا چاہتے ہیں اسی کی ساتھ ساتھ تجزیہ مضامین کے نقطۂ نظر سے ہر مضمون پر جامع عنوانات قائم کیئے جانے کا بھی اہتمام کیا گیا ہے تاکہ بلند مضامین کے الگ الگ ٹکڑے متمیز ہوکر متدرج ذہن میں بیٹھتے چلے جائیں اور پھر ان عنوانوں سے کتاب کی فہرست بھی سہولت کے ساتھ بنائی جاسکے جو کتاب کے مضامین کا آئینہ ہو۔

اس عظیم و جلیل مہم کے لیے مجلس معارف القرآن کی نگاہِ انتخاب حضرت مولانا اشتیاق احمد صاحب دام مجدہٗ استاذ دارالعلوم پر پڑی جو دارالعلوم کے

قدیم فضلا میں سے ہیں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ کے تلمیذ رشید ہیں، ذی استعداد عالم اور ایک صاحب ذوق علمی مفکر ہیں۔ حضرت شمس الاسلام نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتابوں سے خاص مناسبت رکھتے ہیں۔

چنانچہ حضرت والا کی معرکۃ الآراء کتاب مصابیح التراویح پر جامع عنوانات لگا کر اُس کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کر چکے ہیں جو دارالعلوم کے شعبۂ نشر و اشاعت کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔

نیز آپ ہی نے حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہٗ کی تصنیفِ لطیف ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء کے ترجمہ کی بھی تکمیل فرمائی ہے، جسے حضرتِ اقدس مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ نے شروع فرمایا تھا، مگر ایک ہی جلد کا ترجمہ ہونے پایا تھا کہ وفات ہوگئی، مولانا موصوف نے اُس کی تکمیل فرمائی جس کی تین ضخیم جلدیں تکمیل ہو کر ایک جزو شائع بھی ہو چکا ہے اور دوسرا زیرِ کتابت ہے۔

نیز اور بھی بعض تاریخی اور ادبی کتب کے آپ مترجم ہیں اس طرح حکمتِ ولی اللّٰہی اور حکمتِ قاسمیہ دونوں سے آپ کی نگاہیں آشنا ہیں، ساتھ ہی آپ سلسلۂ نقشبندیہ کے مجازِ طریقت اور صاحبِ سلسلہ بزرگ بھی ہیں اور علم کے ساتھ باطنی اور عرفانی ذوق بھی بہم ہے جو ان عارفانہ حقائق کی خدمت کے لیئے خاص طور پر ضروری اور ناگزیر ہے۔ ان ہی صفات و حسنات کے پیشِ نظر حکمتِ قاسمیہ کی خدمت کے لیئے آپ کا انتخاب عمل میں لایا گیا جو الحمدللہ صحیح ثابت ہوا اور آپ نے اس چھ سات ماہ کی مختصر سی مدت میں حضرت شمس الاسلام

کی تین کتابیں حجۃ الاسلام، جواب ترکی بہ ترکی اور انتصار الاسلام بطرزِ مذکور مکمل فرمائیں جو پریس کو جاچکی ہیں اور عنقریب ہدیۂ ناظرین ہونے والی ہیں۔ اور چوتھی کتاب کا آغاز فرمارہے ہیں۔

ان کتابوں میں مولانا موصوف کے قلم سے جو خدمت انجام پائی ہے اس میں اہم چیز یہ ہے کہ آپ نے ان تینوں کتابوں کا تاریخی پس منظر، اُن کی تصنیف کے وجوہ واسباب اور وقت کے مقتضیات اُن میں باہمی تقدّم تاخّر کی نوعیت اور اُن کے اجزاء مسائل کی ترتیب سے متعلق قابلِ قدر تاریخی معلومات بھی فراہم فرماکر ان کتابوں کے مقدمہ وتمہید میں درج کردی ہیں جس سے ان کتابوں کے علوم کی عظمت کے ساتھ اُس دور کے تاریخی ماحول پر خاصی روشنی پڑجاتی ہے جس سے ان کتابوں کی افادیت دوبالا ہوگئی ہے۔ سابق میں حجۃ الاسلام کے مضمون کے دو ٹکڑے الگ الگ اور بے ربط وترتیب شائع شدہ تھے آپ نے انھیں یکجا کرکے حجۃ الاسلام کو مکمل فرمادیا ہے اس لئے ٹائیٹل پر بھی اُس کا عنوان حجۃ الاسلام مکمل ہی رکھاگیا ہے، دوسرا نمبر ترتیبِ مضامین کے لحاظ سے براہینِ قاسمیہ کا رکھاگیا ہے جس کی وجہ ممدوح نے مقدمہ میں ہی ظاہر فرمائی ہے اور تیسرا نمبر اسی علمی ترتیب پر انتصار الاسلام کا ہے بقیہ سلسلوں میں بھی اسی طرح علمی ترتیب انشاء اللہ ملحوظ رہے گی، اسی کے ساتھ حکمتِ قاسمیہ کی اس علمی اور تاریخی اہمیت سے کہ وہ روایت ودرایت کے ایک جامع مکتبِ فکر کی اساس ہے۔

عالمِ اسلام کے غیر اُردو داں علمی طبقات کو بھی غیر معمولی طور پر اس کا مشتاق

بنا دیا ہے جس کا دارالعلوم میں تشریف لانے والے ممتاز علماء عرب و عجم نے اظہار فرمایا۔ مجلس معارف القرآن نے علماء ملت کی اس آرزو کا کماحقہٗ احترام کرتے ہوئے "حکمۃ قاسمیہ" کے ان بیش قیمت شہ پاروں کو عربی اور انگریزی زبانوں میں منتقل کرنے کو مقصدی درجہ دیا ہے جس کا آغاز حضرت اقدس نانوتویؒ کی بیش قرار قرآنی تحقیق "تفسیر المعوذتین" (عربی) سے کیا جا چکا ہے جو ٹائپ کے حروف میں نہایت مزین انداز سے شائع ہو چکی ہے اور دیگر کتب کی "تعریب" بھی پروگرام میں شامل کر لی گئی ہیں۔

ضرورت ہے کہ ارباب علم و فضل اور بالخصوص فرزندانِ دارالعلوم دیوبند ان جواہر ریزوں سے خود بھی فائدہ اٹھائیں اور اپنے اپنے حلقہ ہائے اثر میں ان نادر علوم کی اشاعت کریں کہ اس دور کے فلسفیانہ الحاد کا زہر اسی تریاق سے دفع ہو سکتا ہے۔

اس لیے ان علوم کی اشاعت نہ صرف اُن کے لیے نافع ہی ہے بلکہ بتقاضائے وقت ان کا فریضہ بھی ہے کیونکہ دارالعلوم دیوبند محض ایک درسگاہ ہی نہیں بلکہ ایک مستقل مکتبِ فکر بھی ہے اور وہ فکر یہی ہے جو ان سفینوں اور ساتھ ہی مستفیض سینوں میں متوارث طریق پر منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے۔

اس طرزِ فکر کے حقیقتاً دو امام ہیں۔ ایک ابتدائی اور ایک انتہائی۔ ابتدائی سرے پر حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلوی ہیں اور انتہائی سرے پر حضرت شمس الاسلام نانوتوی ہیں جنہوں نے اس دور کے الحاد اور اسلامی سینوں کی سرد مہری کے دفعیہ کا مکمل سامان بہم پہنچا دیا ہے، فرق صرف یہ ہے کہ ولی اللہی حکمت

میں جو اُمور کشف و وجدان کے انداز سے ظاہر فرمائے گئے ہیں وہی اُمور حکمتِ قاسمیہ میں برنگِ استدلال و برہان پیش کیے گئے ہیں جو اغیار پر بھی حجت بن سکتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ ولی اللّٰہی فکر نے فطری طور پر تجدیدِ دین کے اسلحہ کا میگزین تیار کیا اور قاسمی فکر نے برہانی اور مشاہداتی طور پر اُسے ترتیب دے کر مجاہدانہ اسپرٹ سے لشکر سازی کی۔ اگر ان دونوں نقاطِ فکر کے یہ اسلحہ سینوں میں سجا کر دل والے میدان میں آتے رہیں گے تو بقول حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ اس صدی کا فلسفہ کتنے ہی رُوپ بدل بدل کر میدان میں آئے، یہ قاسمی فکر فوراً ہی اُس کا اندازِ قد پہچان کر دم کے دم میں اُس کی قلعی کھول دے گا اور فلسفہ کی ساری ملمع سازیاں کافور ہوتی رہیں گی ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من اندازِ قدت را می شناسم

(مولانا) محمد طیب صدر مجلس معارف القرآن
(مہتمم دار العلوم دیوبند)
۲۸/۴/۸ھ